R-N- 2/86/5

REGD. NO. L922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت پانچ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
یکم - ۸ - ۱۵ - ۲۲

جلد ۲۷ - شمارہ ۳۸	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۸ / اکتوبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

کیا ہم اپنی تاریخ کو جھٹلا سکتے ہیں؟

ادھر کچھ حلقوں سے پھر یہ آواز اٹھی ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا جائے۔ اردو مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے گو اردو بولنے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ پھر جنوبی ہند اور بنگال میں بہت سے مسلمانوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے گو ان میں اردو جاننے کی خواہش اس لئے ہے کہ اس طرح وہ اپنے مذہبی اور مخصوص تہذیبی سرمائے سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں آج بھی خاصی تعداد ایسے غیر مسلموں کی ہے جو اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ پھر اردو کی بنیاد اس کی تاریخ، اس کی روایات، اس کا ادبی سرمایہ، اس کا مزاج ایسا ہے کہ وہ ہندوستان کی مشترک تہذیب کی یادگار اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دینے کے لئے ہندو فرقہ پرست اور مسلم فرقہ پرست دونوں ہم آواز اور ہم زبان ہو جاتے ہیں اور اس سے اس خیال کی بنیادی کجی ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر حیرت اس وقت ہوتی ہے جب بعض قومی نقطۂ نظر رکھنے والے بھی، غالباً حالات کی تلخی سے گھبرا کر ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا رسالہ تحریک، شان ہند اور گگن (بمبئی) میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا تھا ان لوگوں کے خلوص نیت میں کوئی شبہ نہیں، مگر انھوں نے اردو کی ترقی کے لئے غلط نسخہ تجویز کیا ہے۔ جس طرح فرد کو کسی طرح اپنے حسب نسب، خاندان اور ورثے سے انکار نہیں کرنا چاہئے اسی طرح زبانوں کو بھی اپنی بنیاد، ساخت اور ارتقا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے، جو ہندی کی بھی بنیاد ہے، مگر تاریخی، سماجی اور ادبی اثرات کی وجہ سے ایک بنیاد پر دو مستقل آزاد اور خود مختار زبانیں وجود میں آگئی ہیں۔ اس مشترک بنیاد کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ اس آزاد اور خود مختار ارتقا کو جو بعد میں ہوا ہے۔ اس کی نظم و نثر کے سرمائے میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی برابر کا حصہ ہے اور سکھوں اور عیسائیوں کا بھی قابل قدر کام ہے۔ مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی بستے ہیں انگریزی بولنے والے بیشتر عیسائی ہیں، مگر انگریزی عیسائیوں کی زبان نہیں ہے عربی بولنے والے بیشتر مسلمان ہیں، مگر عربی پر عرب عیسائی بھی اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا عرب مسلمان۔ مذہب کا زبانوں کے سرمائے پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے مگر زبانوں کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر نہ کی جا سکتی ہے نہ کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اردو بولنے والوں میں بہت بڑی تعداد ہندوستان کے مسلمانوں کی ہے۔ یہ اسی طرح ہندوستان کے شہری ہیں جیسے دوسرے شہری۔ ان ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و خیالات، ان کے افکار و اقدار، اگر اردو میں آتے ہیں تو ان کی وجہ سے اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہو جاتی ایک جدید ہندوستانی زبان رہتی ہے اور رہے گی، ہاں اس پر اگر کچھ مخصوص تہذیبی میلانات کی جو مسلمانوں کے یہاں نمایاں ہیں، چھاپ ہے، تو اس سے ہندوستانی تہذیب کی رنگا رنگی ظاہر ہوتی ہے جس پر فخر کرنا چاہئے، مگر جس کی وجہ سے ہم اسے کسی فرقے کے حوالے نہیں کر سکتے یہ اپنی میراث کے ساتھ غداری ہوگی۔ زبان کا مذہب سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ زبان ایک تہذیبی آلہ ہے اور دوسرے تہذیبی آلات کی طرح یہ بھی مذہب سے متاثر ہوتا ہے مگر اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ اگر جمہوری ہندوستان میں لسانی اقلیتوں کو ان کا حق نہیں ملا ہے، تو ہمیں جمہوری روایات کو مستحکم کرنا چاہئے، اگر مذہبی اقلیتوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو سیکولرزم کے مسلک کو کاغذ کی زینت رکھنے کے بجائے عام زندگی کا آئین بنانا چاہئے۔ دراصل حقیقی خرابی یہ ہے کہ جمہوریت اور سیکولرزم کا نام سب لیتے ہیں مگر اس پر عمل بہت کم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس معاملے میں قصور اکثریت اور سیاسی پارٹیوں

کا زیادہ ہے اور جو سیاسی پارٹی اب تک برسر اقتدار رہی ہے اس کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے کہ اس نے جمہوریت اور سیکولرزم کا نام تو لیا مگر اسے دلوں میں جاگزیں کرنے اور عام زندگی کی وضع بنانے کے لئے بہت کم کام کیا۔ اس کے ساتھ ان عناصر کو بھی نہ بھولنا چاہئے جو جمہوریت اور سیکولرزم کے خلاف ہیں اور ملک کی ساری تاریخ کو نظرانداز کرکے اسے صرف قرون اولیٰ کے ہندوستان میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ تمام اردو دوستوں کا فرض یہ ہے کہ جمہوریت کو کمزور کرنے والے اور سیکولرزم کو برا کہنے والے عناصر کے خلاف صف آرا ہوں۔ جمہوریت اور سیکولرزم کا ابھی تک ہمارے یہاں کوئی قابل فخر روپ سامنے نہیں آیا۔ اس کی ذمہ داری ہم سب پر ہے، مگر ہمارا راستہ یہی ہے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ صرف اسی کے ذریعہ سے ہم اپنی پچاس کروڑ آبادی کو خوشحالی، ذہنی آسودگی اور ہمہ حالی ترقی تک لے جا سکتے ہیں۔ گاندھی جی سے ایک زمانے میں جب کانگریس میں قوم پرست مسلمان بہت کم تھے، کسی نے کہا کہ اس کا نام ہندو کانگریس رکھ دیا جائے۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس میں ایک بھی مسلمان نہ رہے تو بھی یہ انڈین نیشنل کانگریس رہے گی، کیونکہ اس کا مقصد پوری ہندوستانی قوم کی خدمت کرنا ہے۔ یہ اس خدمت کی ذمہ داری کیسے ترک کرے۔ ہمارے کچھ دوست اس بات سے رنجیدہ ہوتے ہیں کہ غیر مسلموں میں صرف وہی لوگ اردو کو اپنانے پر تیار ہیں جو چالیس سے اوپر ہیں اور نوجوان اردو کو ترک کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں، لیکن یہ ان کا فعل ہے۔ وہ اگر اپنے تہذیبی سرمائے سے اور اپنی میراث سے انکار کرتے ہیں تو ان کا نقصان ہوگا۔ ہم کیسے اپنی میراث سے انکار کردیں۔ اردو اور ہندوستان دونوں کا بھلا اپنی پوری تاریخ کو اپنانے میں ہے۔ اسے کسی خاص مذہبی گروہ سے وابستہ کرنے میں نہیں۔ بہت سے لوگ اردو کو اس لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ اردو کے ذریعہ سے وہ روزی نہیں کما سکتے۔ ایسے صرف غیر مسلم نہیں ہیں، مسلمان بھی ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو صرف ان کا فرض ہی یاد نہیں دلانا ہے ان کے لئے روزگار بھی مہیا کرنا ہے۔ آج بھی اردو بہت سے غیر مسلموں کو روزگار دے رہی ہے۔ اگر ہم موجودہ دور کے تقاضوں کو سمجھیں اور اخبارات و رسائل اور ہر قسم کی کتابوں کی بہتر اشاعت پر توجہ کریں تو یہ اور زیادہ لوگوں کے لئے روزگار فراہم کرے گی۔ کاش اردو کے مسئلے کو خالص لسانی، قومی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا اور اسے موجودہ سیاست کے داؤ پیچ کا آلہ نہ بنایا جاتا تو اردو کی قومی حیثیت اور واضح ہوتی۔ اردو کی ترقی کے لئے اس کی بنیاد اور اس کے ارتقا، اس کی روایات اور اس کے مزاج سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں، جمہوریت اور سیکولرزم کی طاقتوں کو ملک میں مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور اس لئے اردو دوستوں کو صرف اردو کے لئے ہی کام نہیں کرنا ہے، ملک کی مضبوطی اور خوشحالی کے لئے بھی کام کرنا ہے۔ یہ غلط ہوگا کہ جب تک اردو والوں کے مطالبات منظور نہ ہوں وہ ملک کے مسائل سے دلچسپی نہ لیں اور ملک کو آگے بڑھانے میں مدد نہ دیں۔ ہمارا ملک ترقی کرتا ہے تو ہم بھی ترقی کرتے ہیں۔ ہمارا ملک گرتا ہے تو ہم بھی گرتے ہیں۔ ہاں ہمارا یہ ضرور خیال ہے کہ حکومت اور اکثریت کو اس لئے خاص طور سے اردو کی راہ میں دشواریاں دور کرنا چاہئیں کہ وہ جمہوریت اور سیکولرزم کی روایات کو اور قومی یکجہتی کے تصور کو ملک میں جاگزیں کرنے کے لئے مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے زیادہ اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ اردو سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے وہ ایک کل ہند زبان ہے اور اس کی ترقی پورے ملک کی ترقی پر بہرحال اثر انداز ہوگی۔ اس کی زبوں حالی بھی اسی طرح پورے ملک کی زبوں حالی میں اضافہ کرے گی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں دو کروڑ اڑتیس لاکھ اردو بولنے والے ہیں جبکہ مسلمانوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے یعنی ساڑھے چار کروڑ کے لگ بھگ۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی آدھی تعداد نے اپنی مادری زبان اردو نہیں لکھوائی، اور ایک قابل لحاظ غیر مسلم آبادی نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی ہے۔ کیا ہم اس غیر مسلم آبادی سے جو اردو کو آج بھی اپناتی ہے یہ کہہ دیں کہ جاؤ تم غلطی پر ہو، اردو تمہاری زبان نہیں۔ ہمارا فرض اردو کی خدمت کرنا ہے اس کو کسی کے نام نیلام کرنا نہیں۔

اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں ریونیو بورڈ کی ہدایت

گورکھپور: معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ بورڈ آف ریونیو یوپی نے تمام ضلع کلکٹران اور کمشنروں کو ہدایت دی ہے کہ ریونیو کورٹ مینول پیرا ۱۳ کے مطابق تمام دستاویزات اردو زبان میں بغیر کسی دوسری زبان کے ترجمے قبول کی جائیں، نیز یہ ہدایت بھی کی ہے کہ اردو رسم خط میں دوسرے قسم کی درخواستیں، توجہ نامے وغیرہ بھی قبول کئے جائیں۔ اس سرکلر کا اطلاق دفاتر نیز مالیاتی عدالتوں پر یکساں طور پر ہوگا۔

(قومی آواز)

فیض احمد فیض کے مجموعۂ کلام کی سوویت یونین میں اشاعت

الماآتا، قزاقستان کے ادبی اشاعت گھر نے نغمۂ مشرق کے نام سے فیض احمد فیض کا مجموعہ کلام قزاق زبان میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں فیض کی کئی غزلوں اور نظموں کے تراجم شامل ہیں۔ پاکستانی شعرا یوسف ظفر اور احمد ندیم قاسمی کا کلام سوویت یونین میں پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔

(حیات)

[illegible]الدین شاذلی

میتھو آرنلڈ — اور مشینی عہد کا المیہ

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے میتھو آرنلڈ نے مشینی دور کے اس کرب کو محسوس کر لیا تھا جو آج "شہر کے المیہ" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اور جس کی کوکھ سے "تنہائی کا احساس" اور "فرد کی ذات" جیسے مسائل نے جنم لیا۔

اگر ان مسئلوں پر دیانت اور وسیع القلبی کے ساتھ غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ آرنلڈ سے بہت پہلے اس کے پیش رو ورڈسورتھ اور کالرج وغیرہ نے "انقلاب فرانس" کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں شہروں میں ہونے والی قتل و غارتگری سے خوفزدہ ہو کر انسانیت کو "فطرت کی طرف واپسی" کا جو مشورہ دیا تھا اس میں کتنی حقیقت اور سچائی تھی۔ ان شاعروں کی نیت پر شبہ کرنا اور یہ کہہ دینا کہ انھوں نے فطرت پرستی کا سبق دے کر انسان کو شہری زندگی کے ہنگامہ خیز دائرے سے باہر کر دیا تھا، مناسب نہیں ہے۔ ورڈسورتھ نے یہی تو کہا تھا کہ انسان فطرت سے دور ہو کر شہر میں درندہ بن گیا ہے۔ اگر کسی طرح اسے پھر سے موقع فراہم کر دیا جائے جہاں وہ فطرت کو بے نقاب دیکھ کر اور اس سے دو بدو باتیں کر کے اپنے احساسات اور ماحول کو ہم آہنگ کر لے، تو یقیناً اسے ذہنی اور روحانی سکون مل جائے گا۔ وہ سکون جسے شہر کے انسانیت کش صفات اور اعمال نے برباد کر دیا ہے۔ اگر یہ مراجعت "ہنی رومانوی" اور غیر فطری ہے یا انسانیت کے لئے مفید نہیں ہے تو پھر شہری ہنگاموں سے اکتا کر ذات اور تنہائی کے خول میں بسر ہونا بھی ایک رومانوی انداز ہے اور اسے بھی ایک قسم کی مراجعت یا فراریت کہا جا سکتا ہے۔ آرنلڈ کی شاعری اور ماحول کے پس منظر میں ان مسائل کو دیکھنا مناسب ہے۔

آرنلڈ نے جب ہوش سنبھالا تو انگلستان میں وکٹوریہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ تخت پر بیٹھتے ہی وکٹوریہ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے زراعت، صنعت، کلچر، تہذیب، علم و ادب اور شعر و فن سب پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ وکٹوریہ نے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں ان سب کو ترقی ہوئی۔ مگر سب سے زیادہ فروغ تجارت اور صنعت کو ہوا۔ ۱۸۳۲ء میں "پہلا ریفارم ایکٹ" (FIRST REFORM ACT) اور ۱۸۴۶ء میں "ریپیل آف دی کارن لا" (REPEAL OF THE CORN LAW) اور ۱۸۶۷ء میں "دوسرا ریفارم ایکٹ" (SECOND REFORM ACT) کا نفاذ ہوا۔ ان قوانین نے انگلستان کی کایا پلٹ کر دی۔ ملک زراعت کو چھوڑ کر ایک دم صنعت و حرفت کی طرف مائل ہو گیا، "ریفارم ایکٹ" نے متوسط طبقے کو صاحب اقتدار بنا دیا۔ اور "کارن لا" (CORN LAW) سے تجارت کو بے انتہا ترقی ہوئی۔ سرمایہ دن بدن بڑھنے لگا اور چیزیں بنانے کی مشینیں ایجاد ہونا شروع ہو گئیں۔ "فیکٹری ایکٹ" اور "مائنس ایکٹ" (MINES ACT) لاگو ہونے کے باوجود سرمایہ داروں اور مالکوں کے لئے یہ زریں عہد تھا، دوسری طرف قلیل سرمایہ رکھنے والوں کا حال تباہ ہو رہا تھا۔ ان کی خوشحالی ختم ہوتی جا رہی تھی ۱۸۵۱ء کی بڑی نمائش نے یہ یقین دلا دیا کہ صنعتی حیثیت سے انگلستان کا مرتبہ بہت بلند ہو چکا ہے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد "آزاد تجارت" کے ایسے اصول وضع کئے گئے اور ان پر اس ڈھنگ سے عمل ہوا کہ ملک کی تجارتی اور مشینی رفتار کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

عہد وکٹوریہ میں سائنس، آرٹ اور علم و ادب کے ساتھ صنعتی ترقی کتنی تیزی کے ساتھ ہوئی اس کا اندازہ اس صدی میں ہونے والی مشینی ایجادات سے لگایا جا سکتا ہے۔ چرخے سے لیکر بھاپ کے انجن تک اور ماچس سے لیکر بجلی تک کس قدر صنعتی ارتقاء ہوا ہے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ان تمام مادی ترقیوں کے ساتھ علم و ادب کے فروغ نے لوگوں کے ذہن و دماغ کو بڑی حد تک بدل دیا۔

وکٹورین عہد کے اس سماجی، تہذیبی، علمی اور صنعتی پس منظر میں جب آرنلڈ کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو دو نہایت اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔ عہد وکٹوریہ کا ذہنی انتشار (VICTORIAN UNREST)
۲۔ شہری زندگی کا کرب اور تنہائی کا احساس (MELANCHOLY MOOD)

نوشتہ: (آرتھر ویلی)
مترجم: (ابراہیم ناظم دت)

سرخ توتا

یہ اس نظم کا ترجمہ ہے جو آرتھر ویلی نے برٹرانڈ رسل کو ۱۹۱۸ء میں بھیجی جب کہ وہ جیل میں قید کاٹ رہا تھا۔

آنام سے اک تحفہ آیا
ایک سرخ توتا
گلنار کی طرح گل رنگ!
جو آدمیوں کی بولی بولتا تھا
اس کے ساتھ وہی ہوا جو
علم اور عقلمندی کے ساتھ ہوتا آیا ہے
انھوں نے مضبوط سلاخوں کا ایک پنجرہ بنایا
اور اس میں اس کو بند کر دیا۔

میتھو آرنلڈ اپنے ہمعصر شعرا، براؤننگ، اور ٹینی سن کے مقابلے میں اس حیثیت سے برتر تھا کہ اس کے یہاں اس دور کا ذہنی انتشار جتنی شدت سے ملتا ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں ہے۔ وقت کی دکھتی ہوئی نبض پر اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ اپنے دور کی مادی ترقی، مالی بہبودی اور صنعتی اور تجارتی خوشحالی سے قطعی مطمئن نہیں تھا۔ سائنسی ایجادات اور مشینوں کے فروغ سے ملک میں جو فضا پیدا ہوگئی تھی اور اس کے نتیجے میں انسانی روح اور احساسات جس طرح کچلے جارہے تھے، ان سے وہ متفق نہ تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ انسانی طبقہ تھا جو اقتصادی ترقی، مالی بہتری اور سرمایہ داری کی وجہ سے تو تنومند ہوتا جارہا تھا لیکن ذہنی اور روحانی اعتبار سے اس کا سکون منتشر ہوچکا تھا۔ مذہب، اخلاق، بھائی چارگی، انسانیت، خلوص، یگانگت، ایمان، یقین غرض سب انسانی رعنائیاں جھوٹی ثابت ہورہی تھیں اور اپنی موت آپ مررہی تھیں۔ انسان دولت اور مشینوں کے اس بیکراں سمندر میں بے سہارا ادھر ادھر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا کہ کہیں دلی مسرت اور ذہنی یقین و سکون حاصل ہوجائے۔ لیکن وہ تو ناپید ہوچکا تھا۔

یہی وہ دور تھا جب سائنس، معاشیات اور دولت و تجارت کے نظریوں نے انسانوں کو مشینوں کی طرح بے روح کردیا تھا۔ اور ان سے ہماری پرانی قدریں چھین لی تھیں۔ اس نازک زمانے میں انسان کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی سہارا نہ رہا تھا۔ نہ یقین، نہ ایمان، نہ ذہنی آسودگی ۔۔ اس پر مزید ستم یہ تھا کہ وقت نے پرانے اقدار کو فنا تو کردیا تھا لیکن ان کی جگہ نئی قدروں کو حیا کرنے کا کوئی یقین نہیں دلایا تھا۔ ایسے ماحول میں انسانی ذہن کو سوائے پریشانی اور انتشار کے مل بھی کیا سکتا ہے۔ عہد وکٹوریہ کے سماجی نظام کی ابتری اور ذہنی انتشار میں یہی عوامل کارفرما تھے۔ قدروں کی شکست و ریخت نے انسان کا ذہنی سکون اس طرح چھین لیا تھا کہ اب اسے مذہب، اخلاق، تہذیب اور روح سب بیکار چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔ اس پریشانی اور مصیبت میں آرنلڈ بھی سب کا شریک تھا۔ وہ شاعر تھا۔ حساس طبیعت کا مالک۔ اس نے وکٹورین عہد کی تمام زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس مشینی دور کے کرب کو اپنی شاعری میں سمو دیا اور اسے عہد وکٹوریہ کے ذہنی انتشار کا آئینہ بنادیا۔

آرنلڈ کو شیلے کے اس قول سے اتفاق نہ تھا کہ ۔۔ مستقبل قریب میں انسانیت کی ازسرنو تشکیل ہوگی۔ مستقبل کی طرف جب اس کی نگاہ جاتی تو وہاں سوائے دھند اور کہرے کے اور کچھ نہ دکھائی دیتا۔ ماضی اپنی قدروں کو لئے ہوئے دفن ہورہا تھا حال اپنے مشینی ڈھانچے میں کسا کسایا تیار کھڑا تھا جو مالی ترقی کی ضمانت تو دیتا تھا مگر ذہن اور روح کو تسکین بخشنے کا کوئی سہارا فراہم نہ کرسکتا تھا بلکہ انسان کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

آرنلڈ نے اس کیفیت کو ایک نظم میں بیان کیا ہے۔

"میں دو دنیاؤں کے درمیان سے گزر رہا ہوں
ایک مردہ ہوچکی ہے۔ اور دوسری جو پیدا ہونے والی ہے۔
انتہائی بے بضاعت ہے
میں کسی پر بھی اپنا سر نہیں ٹکا سکتا
میں اسی طرح تنہا اور غمگین انتظار کرتا رہونگا"

اسی نظم میں آگے لکھتا ہے۔

"ہمارے اجداد نے ۔۔ وقت کے اس سمندر میں
جس پر ہم بہہ رہے ہیں۔ ساتھک رہبری کی ہے۔
ان کی آوازیں ان لوگوں کے کانوں میں گونج رہی ہیں
جو اپنی طاقت اور مست بیکار کی خوشی کے ساتھ گزرتے تھے
وہی سمندر آج بھی ہمارے چاروں طرف جوش کھا رہا ہے
مگر ہم خاموش اور گونگے بنے ہوئے اس کی لہروں کو
تک رہے ہیں۔"

"FRANZ OPPEN HEIMER" اپنی کتاب (THE STATE) میں اس زمانے کی پریشان انسانیت کی ایک جھلک دکھاتا ہے۔

"ہمارے آج کے سرمایہ دارانہ دور میں ان تمام فطری رشتوں کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوگئی ہے جن میں کوئی فرد پناہ لیتا تھا۔ ہمارے اجتماعی بندھن ڈھیلے پڑگئے ہیں۔ آج ہر فرد خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا ہے۔ مقابلے کے اس بپھرے ہوئے سمندر میں (جو ہمارے سامنے ہے) ہر شخص اپنی ذاتی سمجھ اور کوششوں ہی پر بھروسہ کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اجتماعی فکر و شعور اور ہزاروں سال کے تجربات سے حاصل کی ہوئی عقل آج انسان کی نہ رہنمائی کرسکتی ہے اور نہ حفاظت۔ ان کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔"

اس دور کے انتشار کا خاص سبب آرنلڈ یہ بتاتا ہے کہ انسان "تشکیک" کا شکار ہوکر رہ گیا تھا۔ امید اور یقین کی دولت کھو جانے سے اسے ہر شے جھوٹی اور غیر حقیقی معلوم ہوتی تھی وہ اگر کسی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتا اور اس پر اپنے ایمان کی بنیاد رکھنا چاہتا تو وقت کے پیدا کردہ شکوک شبہات اور توضیحات اس کے ذہن و دماغ کو منتشر کردیتے۔ آرنلڈ ایک نظم "DOVER BEACH" میں یقین اور ایمان کا مرثیہ اس طرح لکھتا ہے۔

"یقین کا لبریز سمندر —
پہلے دنیا کے کناروں کے گرد
ایک چمکدار اور لپٹی ہوئی پیٹی کی مانند چڑھا ہوا تھا
لیکن اب میں صرف اس کی طویل، غمگین،
اور بتدریج فنا ہوتی ہوئی پکار کو سن رہا ہوں۔"

'SCHOLAR GIPSY' آرنلڈ کی شاہکار نظم سمجھی جاتی ہے جس میں صنعتی ترقیوں کی لعنتوں کو دکھایا گیا ہے۔ اور انسان کے اس ذہنی انتشار کی عکاسی کی گئی ہے جو نئے سماجی اور اقتصادی نظام سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نظم میں آرنلڈ نے ایک ایسے ذہین طالب علم کی تخلیق کی ہے جو آکسفورڈ میں پڑھتا تھا۔ جس نے اپنے ماحول کی نئی ترقیوں سے دل برداشتہ ہو کر یونیورسٹی کی تعلیم ترک کر دی اور جنگلوں میں آوارہ گرد بنجاروں کے گروہ میں شامل ہوتے خود آوارہ گرد اس نیت سے بن گیا کہ ان لوگوں (آوارہ گرد) کی صحبت میں رہ کر ان سے وہ علم حاصل کر لے جو روحانیت کا سرچشمہ ہے اور جس کے ذریعہ موجودہ زمانے کی مادی ترقی کا کرب اور ذہن کے انتشار کو مٹایا جا سکے۔ یا اس کا حل تلاش کیا جا سکے آرنلڈ نظم میں اس آوارہ گرد لڑکے کو علامت کے طور پر پیش کرتا ہے اس نے دنیا کو چھوڑ کر اور بنجاروں میں شامل ہو کر اپنے آپ کو غیر فانی بنا لیا ہے۔ وہ ذہنی اور روحانی سکون کی علامت ہے جو مادیت سے بیزار ہے۔ نظم میں ایک جگہ آرنلڈ اس ذہنی لڑکے کو بنجاروں کی ٹولی میں انھیں جیسا فرسودہ اور شکستہ لباس پہنے ہوئے دنیا کے تفکرات سے دور خوشی میں مگن پاتا ہے تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"(اے لڑکے) تو نے بہت پہلے اس تازہ ہمت کے
ساتھ دنیا کو چھوڑ دیا جو خارجی جہان کے اثر سے
ابھی نہیں مر سکتی
اس ہمت پر تو قائم ہے۔ اور تو نے اُسے (ہماری
طرح) اور چیزوں میں بیکار استعمال کیا۔
اس لئے تو ہماری تھکن اور کمزور تشکیک سے آزاد
ہے۔"

اسی نظم میں آگے آرنلڈ پھر اس لڑکے سے مخاطب ہے اور موجودہ دور کی پریشانیوں سے پہلے کی صاف ستھری اور پرسکون زندگی کو یاد کرتا ہے۔

"موجودہ زندگی کے عجیب و غریب "مرض" سے بہت پہلے، تو اس دور میں پیدا ہوا۔ جب عقل تازہ اور صاف تھی اور زندگی دریائے ٹیمس کی چمکدار لہروں کی مانند رواں تھی۔"

مستقبل کے بارے میں آرنلڈ بہت نا امید تھا وہ جب یہ سوچتا کہ انسان مستقبل کی فکر میں کیسے کیسے غلط تصورات قائم کر لیتا ہے تو اسے ذہنی کوفت ہونے لگتی۔ وہ جانتا تھا کہ مستقبل ایک ایسا سرسبز باغ ہے جو انسان کو حال کے بنجر اور گرم صحرا سے نکال کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے حال سے بھی الگ ہو جاتا ہے اور مستقبل کی رنگینیوں کو بھی گرفت میں لانے سے قاصر رہتا ہے۔ ایک نظم میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

"کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے مبہم اور مشکوک مستقبل کی مسرت کے بارے میں غلط خیال قائم کر لیتے ہیں،
اور جب ہم اس کا تصور کرتے ہیں۔ تو اپنی تمام
موجودہ حالت کو بھلا دیتے ہیں۔ اور اس دنیا سے
کٹ کر الگ ہو جاتے ہیں ۔ اور وہ دنیا بھی ہم سے
دور رہتی ہے جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

ایک نظم میں اپنے عہد کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

" دنیا سے شکار کیا ہوا ۔ اور نفرت کھایا ہوا

اشفاق احمد اعظمی

غزل

کیا جانے آگیا ہے یہ کیسا خراب وقت
ہر لمحہ دل کی موت ہر اک گام پر شکست

یہ تو کہو سنبھالے ہوئے ہیں کسی طرح
وہ الجھی الجھی زلف، ہم افسانہ لخت لخت

ہر سمت ہے خموش چراغوں کی اک قطار
کہتی زبان حال سے خود اپنی سرگزشت

ہم لوٹ لوٹ آئے ہیں اپنی ہی ذات میں
وہ سن رہے ہیں اپنی ہی آواز بازگشت

یہ ندیاں ہیں جاڑے کی برسات کی نہیں
ان میں کہاں وہ جوش کہ ساحل لگائے جست

کمزور دواں ہی ہیں کیا خوف ہے
بیٹھے ہوئے ہیں کیوں یہ ارادے بریدہ دست

زاد سفر تھی ایک فغاں وہ بھی لٹ گئی
اشفاق اور بھی ہوئی راہ حیات سخت

بڑائی کا یہ عذاب آخر کیوں ہے!
کیا یہ اس غرض سے ہے کہ اس کی سادگی اس
حاسد اور دل شکستہ عہد کا تمسخر اڑاتی ہے۔"

اسی نظم میں آرنلڈ اپنے دور کی ان سربلندیوں کا ذکر کرتا ہے جن کو وقت نے اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا تھا۔ اور جن کی قابل قدر صفات پستی میں گھل مل چکی تھیں۔

"عیار اور صاحب تدبیر سروں کے آگے ہر جگہ
بہادر اور مضبوط دل جھکے ہوئے نظر آتے تھے
بڑی بڑی صفات کچل دی گئی تھیں"

اس دور میں آرنلڈ "شہر" کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے مشینی فضا میں گھری ہوئی تمام انسانیت اطمینان اور سکون کی طرف لپک رہی ہے اور یہ ذہنی اطمینان شام کے وقت مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح آہستہ آہستہ رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ شہر میں صنعتی زندگی کا شور و غوغا اور چیخ پکار ہے۔ ہر شخص اپنے کام میں اتنا مصروف ہے کہ اسے اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کی بابت ایک لمحے کے لئے بھی سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ صبح اور شام کی نیرنگیاں، موسموں کی تبدیلیاں اور مناظر فطرت کی گوناں گوں کیفیات اس دنیا کو کس طرح جگمگا کر چلی جاتی ہیں اور روح و دل پر کیسے کیسے تاثرات چھوڑ جاتی ہیں، اس کو کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دنیا میں اشتعال، غصہ، تاریکی اور جھگڑوں کا دور دورہ ہے اور انسان ان سب کے درمیان کھڑا ہے۔ آرنلڈ اس کا نقشہ کھینچتا ہے۔

"میں غصہ، تاریکی، اشتعال اور جھگڑوں کے
درمیان جی رہا ہوں اور ہمیشہ ان سے برسر پیکار
ہوں۔
میں اپنی روح کی گرمی اور روشنی سے بہت دور
ہوں لیکن ان بند صفوں میں رہ کر بھی مطمئن نہیں
ہوں۔"

اپنی نظم "THYRSIS" میں آرنلڈ شہر کے ہنگاموں سے اکتا کر اپنے عزیز دوست (THYRSIS) کے ساتھ سکون سے گزارے ہوئے ان لمحوں کی آوازوں کو یاد کرتا ہے جن سے اب بھی اطمینان کی روشنی ملتی ہے۔ آرنلڈ اپنے دوست سے مخاطب ہے۔

"بڑے شہر کی محنت، کمزوری اور دل کو تکلیف پہنچانے
والی چیخ پکار میں سے
تیری آواز سرگوشی کرتی ہوئی ابھر آتی ہے اور
نوحہ اور تھکن کا پیچھا کرتی ہے۔"

آرنلڈ نے جگہ جگہ اپنی نظموں میں جب شہر کا ذکر کیا ہے تو اسے شور و غل اور آبادی سے بھرا ہوا بتایا ہے۔ کہیں اسے "OPULOUS CITY" کہا ہے تو کہیں "NOISY TOWN"۔

ایک نظم (RESIGNATION) میں ایک شاعر دکھایا گیا ہے جو بلندی سے شہر کی ہنگامہ خیز زندگی پر نظر ڈالتا ہے۔

"کسی بلند مقام سے وہ لوگوں کی بھیڑ اور آبادی
سے بھرے ہوئے شہر پر شام کے وقت نظر ڈالتا
ہے جب سورج چھپنے کے قریب ہے۔
وہ روشن سڑک پر، خوشی میں جھومتی ہوئی انسانوں
کی ان ٹولیوں کا جائزہ لیتا ہے جو اپنے دن بھر کی محنت
اور کاموں کے بعد تیزی سے رواں دواں ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنے ساتھ
کوئی خبر یا پیغام لئے ہوئے ہے۔ اور یہ نہیں کہتا۔
"میں تنہا ہوں"

اسی نظم میں آرنلڈ ایک جگہ اپنے ہمسفر (FAUSTA) سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہم اور تم تنہا پھر اس جگہ پر چل رہے ہیں —
ہم تم گویا لوگوں کی ہنگامہ خیز صحبتوں کے دو روحانی
پیکر ہیں — دو آسیب ہیں۔
اس چمکتے ہوئے صاف اور کم گہرے چشمے کے کنارے
جہاں سے بہت دور نیچے کی طرف ہلکے دھوئیں کی
ٹولیوں میں لپٹا ہوا شور و غل سے پُر شہر نظر آ رہا ہے
— یہیں ہم بیٹھیں گے اور اپنے رازوں کو بے نقاب
کریں گے۔"

شہری معاشرے کی اذیت ناکی اور مشینی انسانوں کی بھیڑ میں آرنلڈ اپنے ضمیر اور اپنی ذات کی طرف لوٹتا ہے۔ تو وہاں اسے دوسری ہی دنیا نظر آتی ہے۔ یہ دنیا خارجی حالات سے مصالحت کرنے کو بالکل تیار نہیں ہے۔ آرنلڈ محسوس کرتا ہے کہ اس دور نے انسانوں کی انفرادیت کو ختم کر دیا ہے۔ جتھوں کے شور و غل میں فرد کی اپنی آواز دب کے رہ گئی ہے۔ انسان کے سامنے زندگی کی مصروفیتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ ایک سورج کی مانند تنہا اور بیقرار ادھر ادھر پھر رہا ہے۔ فرد کے تمام سماجی رشتے بظاہر بہت مستحکم نظر آتے ہیں۔ اندر سے بالکل ٹوٹ گئے ہیں۔ انسان جب باہری ہنگاموں سے گھبرا کر اپنی ذات کے خول میں پناہ لیتا ہے تو وہاں بھی اسے سکون نہیں ملتا۔

آرنلڈ ایک تنہا فرد کو بھری دنیا میں دکھاتا ہے۔
"تیرے ساز کی آواز ہر جگہ تنہا ہے۔
دیوتاؤں کے دربار میں بھی، انسان کے شہر میں بھی۔"

- انسان کو اپنی تنہائی کا کتنا شدید احساس ہے اور اس کی روح اس بوجھ سے کتنی دبی جا رہی ہے، ذیل کی سطور میں اسی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے (آبادی سے دور پہاڑی پر کھڑے ہوئے ایک تنہا شخص یہ سوچتا ہے)

"میں ___ صرف میں ___
جس کی آرزوؤں کے چشمے خشک ہو چکے ہیں
جس کی روح شکست کھا چکی ہے ___
میں (ان پہاڑوں اور میدانوں کی طرح) تنہائی میں
محبت اور رفاقت کو یکجا نہیں کر سکتا۔
اور نہ اپنے بلند حوصلوں کو آباد کر سکتا ہوں۔
میں ___ تنہا ___ زندگی اور اس کی خوشیوں کے لئے مر چکا ہوں
اس لئے میں ہر شے کے چہرے پر اپنی مردہ دلی کو پڑھ رہا ہوں"

یہی تنہا اور مایوس شخص جب شہر کی چیخ و پکار سے ہٹ کر تاروں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ بھی اسے اپنی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی اجتماعی حیثیت سے ایک گروہ ہیں۔ لیکن انفرادی شکل میں الگ اور اکیلے وہ تاروں سے کہتا ہے۔

"تم بھی ہماری طرح بغیر دوست اور بغیر گھر کے ہو
تم بھی ہماری مانند پریشان ہو۔
لیکن تمہیں ہماری پریشانیوں کا اندازہ نہیں"

فرد اور اس کی تنہائی کے احساس کو آرنلڈ ایک نظم میں یوں پیش کرتا ہے (ایک شخص خود اپنے دل سے باتیں کر رہا ہے)

"یہ دنیا اپنا مخصوص دل رکھتی ہے، جو تجھے پارہ پارہ کر دے گی
تو دنیا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔
تو انسانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل نہیں۔
ان کے خیالات، طور و طریق (خواہشات) تجھ سے میل نہیں کھاتے۔ اور تنہائی کے اس احساس کی وجہ ہی سے تو پریشان ہے۔ تو نہ صرف یہ کہ انسانوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اپنے ساتھ بھی تیرا گذارہ نہیں ہوگا"

ہمارے آج کے معاشرے میں جب "مشینی زندگی کی رفتار" تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور انسان کی تنہائی، غمگینی، بے یقینی اور مایوسی نے بہت سے مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آرنلڈ کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے، کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک صدی پیشتر کے وکٹورین عہد میں تشکیک، احساس تنہائی، فرد کی ذات کا مسئلہ اور پرانی قدروں کی شکست وغیرہ کے سلسلے میں آرنلڈ نے اپنی شاعری میں جو واضح اشارے کئے ہیں، اس سے ملتی جلتی فضا آج ہمارے شہروں کی سماجی زندگی میں موجود ہے۔

کتابیں ملیں

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں۔

سرور سرمدی (مجموعۂ کلام)
مصنف: ناشاد کانپوری
ناشر: ایس پی۔ نگم ناشاد، پانڈو نگر۔ کانپور
صفحات: ۲۰۸
قیمت: چار روپے پچاس پیسے

نیل مرام۔ مصنف حسین محمد اسلم عظیم آبادی
ناشر: مکتبۂ اردو پٹنہ
صفحات: ۲۹۵
قیمت: ساڑھے چار روپے

خطوط بہادر یار جنگ
مرتب: مولوی نذیر الدین احمد
ملنے کا پتہ: ادبی ٹرسٹ بک ڈپو، عابد روڈ حیدرآباد دکن
صفحات: ۱۲۰
قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے۔

— بہزاد —

مراسلات

ریاض العارفین

۱۵ر جنوری ۹۸ء کے "ہماری زبان" میں جناب نیاز حیدر صاحب کا مراسلہ "تنبیہ الغافلین" اور "شعرا رسائل" سے متعلق شائع ہوا ہے۔

یوں تو والد صاحب مرحوم "مولانا شاہ ابوالحسن ادیب" کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بے شمار تھا جس میں قلمی نسخے، نایاب کتابیں اور سلطنت خداداد کے شعرا سے متعلق بھی بہت کچھ مواد تھا اور سب سے پہلے مولانا ادیب نے سلطنت خداداد کے چند شعرا سے متعلق اپنی تصنیف "غازی اعظم" میں تذکرہ کیا تھا جس کے حوالے مصنف "میسور میں اردو"، "ریاست میسور میں اردو کی نشوونما" ترقی اردو بورڈ کراچی اور بہت سوں نے دئے ہیں۔

سن ۱۹۲۳ء میں والد صاحب مرحوم نے ایک مختصر تاریخ "تاریخ میسور" کے نام سے لکھی تھی جو چھ مرتبہ شائع ہو کر چالیس ہزار کی تعداد میں فروخت ہوئی۔ اس کتاب کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے ایک مفصل تاریخ لکھنے کا تقاضہ کیا تو والد صاحب نے ایک مکمل تاریخ اس ملک کی لکھی اور اس کے تین حصے کئے پہلا حصہ جس میں راجگان میسور کے ساتھ ساتھ مختصر طور پر کچھ مسلمان بادشاہوں کا بھی ذکر تھا طبع کرایا تو محکمۂ تعلیم کی ٹکسٹ بک کمیٹی نے اسے وی۔ ٹی۔ سی کلاس کے لئے ٹکسٹ مقرر کر لیا اور دوسرا حصہ "غازی اعظم" سن ۱۹۳۳ء میں شائع کیا جس میں غازی اعظم نواب حیدر علی خاں بہادر والی میسور کے حالات لکھے ہیں اور تیسرا حصہ "شہید اکبر" (جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے) میں شہید اکبر جو سلطان میسور ابوالفتح فتح علی ٹیپو سلطان سے متعلق ہے جب والد محترم بقید حیات تھے تو لاہور کے کسی ایک پبلشر کا اس سلسلہ میں خط آیا تھا مگر چند وجوہات کی بنا پر وہ معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا یہ قلمی نسخہ اب میرے پاس محفوظ ہے (اگر کوئی پبلشرز صاحبان اس سلسلہ میں کچھ مراسلت کرنا چاہتے ہوں تو بہ خوشی اس پتہ پر توجہ فرمائیں۔ انیس نجم الحسن انجم ادیب نمبر ۲۰۳۸ سادسے روڈ منڈی محلہ میسور)

والد محترم کے انتقال کے بعد جو صاحب ہمارے یہاں آئے اور ان کی نظر جس کتاب پر پڑی وہ ساتھ لیتے گئے ایسے ان کی بے شمار کتابیں بٹ چکی ہیں اور چند کتابیں مہاراجہ کالج میسور کی لائبریری کی بھی زینت بنیں اور جو کچھ باقی رہ گئی تھیں وہ میں اور میرے بھائی صاحبان سراج ادیبی، بشیر ادیب اور انور ادیب نے بطور یادگار اپنے پاس رکھ لیں مراسلہ کے شائع ہونے کے بعد میں نے اپنے کتب خانہ کی از سر نو تنظیم کی تو اس میں دکنی نظم کا ایک قلمی نسخہ "ریاض العارفین" نکل آیا جس کی کتابت اچھی ہے کاغذ موٹا ہے اور اس کا حجم ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے بطور نمونہ دو چار شعر ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

شکر کر سر حال ایسا اسحاق توں — حق خدا کے لطف ہور توفیق سوں
یو بزرگان کے بزرگ کا کلام — نظم دکھنی توں دیا زینت تمام
صد ہزاراں شکر رب العالمین — ختم پایا جو "ریاض العارفین"
تھی جو اخبار صحیح مرادیاں — عارفان کا تس تئیں ذکر دیاں
صد ہزاراں شکر رب العالمین — ہوئی ختم "تمت" ریاض العارفین۔

(نجم الحسن انجم ادیب)

نکہت کشمیر

"نکہت کشمیر" کی تدوین کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس میں شعرا کی ان نظموں کو یکجا کیا گیا ہے جن میں انھوں نے کشمیر کے غیر فانی فطری حسن اور تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے متعلق خیالات کا اظہار کیا ہے۔

شعرا سے درخواست ہے کہ ابھی اس مجموعہ میں چند نظموں کی اور گنجائش ہے اس لئے براہ کرم اپنی تخلیقات میرے پاس ۳۱ر اکتوبر تک بھیجدیں۔

(نظر برنی جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵)

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو لسانی سروے کمیٹی کی نشست میں

بہار: لسانی سروے کمیٹی، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی دوسری نشست اعلان کے مطابق بتاریخ ۲۲ ستمبر ۸۰ء بوقت ۹ بجے دفتر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو (تیج لالہ آزاد منزل دریاپور، پٹنہ) زیر صدارت الحاج غلام سرور صاحب صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو منعقد ہوئی۔ نشست میں ایجنڈوں پر غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل تجویز باتفاق رائے منظور کی گئی۔

(۱) آج کی نشست یہ طے کرتی ہے کہ کمیٹی کے اراکین بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے اراکین کے ساتھ تمام ضلعی شاخوں کے مراکز کا دورہ کرکے انجمن کے عام اراکین اور دیگر محبان اردو کو سروے کے لئے رقم فراہم کرنے پر آمادہ کریں۔ دورہ کا کام ۱۵ اکتوبر سے شروع کیا جائے اور ۳۰ اکتوبر تک مکمل کر لیا جائے۔

(پروفیسر مظفر اقبال۔ کنوینر لسانی سروے کمیٹی، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو)

بھاگلپور اردو گرلز ہائی اسکول کا قیام

بھاگلپور: انجمن ترقی اردو بھاگلپور کی سب کمیٹی برائے مجوزہ اردو گرلز اسکول کی ایک نشست زیر صدارت محمد احمد صاحب ایڈوکیٹ منعقد ہوئی جس میں سب سے پہلے جناب ڈاکٹر محمد یونس صاحب کنوینر مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول بھاگلپور نے گرلز ہائی اسکول کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ جناب پروفیسر سید مظفر اقبال صاحب نے مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول کے سلسلے میں سامعین سے کہا کہ اب جبکہ انجمن نے اسکول کے قیام کا فیصلہ کر دیا ہے تو اس سلسلے میں اب ضروری ہو گیا ہے کہ اسے عملی شکل دینے کے لئے پوری کوشش کی جائے اور تعلیم کا آغاز فی الحال آٹھویں کلاس سے شروع کر دیا جائے۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ فی الحال عوامی چندہ نہ کیا جائے بلکہ صاحب حیثیت لوگوں کی ایک فہرست مکمل کر لی جائے اور انھیں کو زیادہ سے زیادہ مالی امداد کی طرف توجہ دینے کو کہا جائے۔ اسکول جب چل پڑے گا اور عوام اس سے روشناس ہو جائیں گے تو پھر ایسی صورت میں عوامی چندہ کا اہتمام کیا جا سکتا ہے حسب ذیل تجاویز کی منظوری کے بعد کارروائی ختم کر دی گئی۔ ۱۔ آج کی یہ نشست طے کرتی ہے مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول کو عملی شکل دینے کے لئے شہر اور مضافات کی کل اردو آبادی سے چندہ طلب کیا جائے لیکن فی الوقت صرف خصوصی چندہ کیا جائے اور عمومی چندہ کی اپیل اشتہارات کے ذریعہ کر دی جائے۔ ۲۔ آج کی یہ نشست طے کرتی ہے کہ مجوزہ اردو گرلز اسکول کو جلد از جلد قائم کرنے کے لئے دو ماہ کے اندر تخمینی رقم اکٹھا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ۳۔ یہ نشست مزید یہ طے کرتی ہے کہ مجوزہ اردو گرلز اسکول کے قیام کے سلسلے میں فی الوقت کم سے کم بیس ہزار روپے اکٹھا کئے جائیں۔ ۴۔ یہ نشست طے کرتی ہے کہ سب کمیٹی کے اراکین شہر اور مضافات کے مختلف علاقوں میں اردو دوستوں سے مل کر ان کو مجوزہ اردو گرلز ہائی اسکول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آمادہ کریں۔ ۵۔ آج کی یہ نشست طے کرتی ہے کہ مجوزہ اردو گرلز اسکول میں صرف دو کلاسیں یعنی آٹھویں اور نویں کھولی جائیں۔

(مسلم)

آسن سول ریلوے کے اسکول سے اردو کی تعلیم ختم کرنے کی کوشش

آسن سول۔ آسن سول ایسٹرن ریلوے بوائز ایچ۔ ایس۔ ایم۔ پی اسکول سے اردو کی پڑھائی کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اردو طلبہ کے داخلہ میں مختلف قسم کی دشواریاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اسکول مذکور کے پرنسپل کا رویہ خاص کر انتہائی جانبدارانہ اور قابل اعتراض بتایا جاتا ہے۔ طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ اسکول مذکور صرف بنگلہ پڑھنے والے طلبہ کے لئے مخصوص ہے اس لئے غیر بنگلہ طلبہ دوسرے اسکولوں میں چلے جائیں۔ اسی بنا پر اردو طلبہ کا داخلہ نہیں لیا جا رہا ہے۔ اسکول مذکور مرکزی حکومت کے زیر انتظام ہے اور خاص کر ریلوے ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا تھا۔ اسکول کے قیام وقت سے ہی یہاں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے لیکن اب اسکول سے اردو ختم کرنے کی کوشش ہے۔ اس سلسلہ میں ریلوے بورڈ نئی دہلی کے چیرمین کو درخواست دی گئی ہے جس میں تمام حقائق کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس وقت اسکول مذکور میں اردو پڑھنے والے بیس طلبہ ہیں اور اردو اور فارسی کے صرف ایک معلم ہیں۔ بنگلہ پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ۱۴۴ ہے جبکہ بنگلہ اساتذہ کی تعداد ۶ ہے۔ اس طرح ۲۳ بنگلہ طلبہ پر ایک معلم ہیں لہٰذا طلبہ کی تعداد کی بنا پر اردو کی تعلیم کے ختم کر دینے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا ہے۔ جو لوگ اسکول مذکور کو صرف بنگلہ اسکول بنانا چاہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مغربی بنگال کے محکمہ تعلیم کی ہدایت کے مطابق جب تک اردو پڑھنے والوں کی تعداد چالیس نہیں ہو جاتی اس وقت تک اردو کی پڑھائی کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ یہ دلیل مضحکہ خیز ہے کیونکہ اس ہدایت کا مقصد لسانی اقلیت والے طلبہ کے لئے سہولت پہنچانا ہے۔ جہاں اردو کی تعلیم رائج ہے وہاں اس ہدایت کی بنا پر اردو کی تعلیم کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

پنجاب میں اردو کے ساتھ ناانصافی

امرتسر۔ زبان کے جھگڑوں نے مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کے ساتھ شدید ناانصافی ہو رہی ہے، بالخصوص پنجاب میں اسے مکمل طور پر نیست و نابود کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک ادبی سرگرمیوں کا تعلق

ہے۔ تقسیم وطن سے پہلے ہندوستان میں پنجاب اردو کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ آج بھی جب کہ اسے نیست و نابود کرنے کی مجنونانہ مہم باونویں سال میں داخل ہو چکی ہے۔ اس صوبہ میں اردو خواں افراد کی تعداد ہندی داں اور پنجابی داں افراد کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس دعوے کا واضح اور ناقابلِ تردید ثبوت درکار ہو تو یہاں کے اردو اخبارات کی اشاعت سے ہندی اور پنجابی کے اخبارات کی اشاعت کا مقابلہ کر لیجئے۔ مشکل یہ ہے کہ اردو کو غلط طور پر مسلمانوں کی زبان سمجھ لیا گیا ہے اور چونکہ تقسیم وطن کے بعد پاکستانی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کا نکاس اور ہندوستانی پنجاب سے مسلمانوں کا نکاس اجتماعی سطح پر عمل میں آیا۔ یہاں سے اردو کا دیس نکالا بھی ارباب سیاست کی نظروں میں ضروری قرار پایا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہی ارباب سیاست جو پبلک طور پر اردو کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ نجی بات چیت میں اس کی گوناگوں خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی حق تلفی پر ہمدردی کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان کے پبلک اور پرائیویٹ طرز عمل میں یہ تضاد ان کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہے۔ یہ صورت حالات اردو کی کس مپرسی اور حق تلفی کا بہت بڑا سبب ہے۔ اسکولوں اور سرکاری دفتروں کے دروازے اردو پر کلیتاً بند ہیں۔ صرف محکمہ السنہ کی طرف سے اس کی سرپرستی ہوتی ہے۔ مگر برائے نام حکومت پنجاب کے بجٹ میں زبانوں کی ترقی کے لئے رقم رکھی جاتی ہے اس کا زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد اردو کے حصے میں آتا ہے۔ باقی ۹۵ فیصد پنجابی اور ہندی پر صرف ہوتا ہے۔ (مرسلہ سورج تنویر)

پنجاب کو یک لسانی ریاست تسلیم کرنے سے گووند داس کا انکار

فیروز پور، ممبر پارلیمنٹ اور ہندی کے ادیب سیٹھ گووند داس نے آج یہاں کہا ہے کہ ہم پنجاب کو یک لسانی ریاست تسلیم نہیں کر سکتے ہیں۔ پنجاب کے ۸۰ فیصدی لوگ ہندی جانتے ہیں اس لئے انھیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ ان کی زبان کو بھی سرکاری درجہ دیا جائے۔ سیٹھ جی نے بتایا کہ ۳۱ دسمبر تک ہندی کو ہندی ریاستوں کی سرکاری زبان نہ بنا دیا گیا تو ہم وزرائے اعلیٰ کا گھیراؤ کریں گے اس کے لئے ۵ لاکھ رضاکار بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے کہا کہ ہماری تحریک پر امن ہوگی۔ (قومی آواز)

ہریانہ میں یوم جمہوریہ سے صرف ہندی

چنڈی گڑھ، ہریانہ میں تمام سرکاری کام کاج کو صرف ہندی میں انجام دینے کے لئے مناسب تیاریاں کی جا رہی ہیں صرف ہندی میں سرکاری کام کاج کے حکم کا نفاذ اگلے یوم جمہوریہ سے ہوگا۔ ہریانہ حکومت کا محکمہ لسانیات سرکاری ملازموں کو ہندی سکھانے کی مہم میں مصروف ہے۔ ہندی شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کے خاص کلاس چل رہے ہیں۔ (قومی آواز)

کسی کے دبانے سے تہذیب یا زبان کو مٹایا نہیں جا سکتا

لکھنؤ: ڈاکٹر اپادھیائے جو غالب صد سالہ جشن و غیر سرکاری کمیٹی کے زیر اہتمام ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کے فرقہ واریت کے خلاف اور قومی یک جہتی یک روزہ کنونشن کی صدارت کر رہے تھے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں سے کہا کہ اس وقت آپ کے قلم کو کلہاڑی بن جانا چاہئے اور مذہب کے نام پر ملک میں جو منافرت اور جذبات ابھرتی چلی آ رہی ہے اس کا بھرپور جواب آپ کی طرف سے ہونا چاہئے۔" کنونشن کا افتتاح بنارس ہندو یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر ہزاری پرشاد دویدی اور صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم کرنے والے تھے لیکن ان دونوں نے کنونشن میں شرکت نہیں کی ڈاکٹر عبدالعلیم کی عدم شرکت خیال کیا جاتا ہے کہ اس تلخی کی بنا پر ہے جو کنونشن کے دعوت نامے سے پیدا ہوئی ہے جس میں ان کو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر لکھا گیا ہے اور "مسلم" کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے جب کہ ڈاکٹر دویدی کے نام کے ساتھ بنارس ہندو یونیورسٹی لکھا گیا ہے۔ افتتاح کے فرائض مرکزی نائب وزیر قانون و اوقاف جناب یونس سلیم نے ادا کئے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں افسوس کے ساتھ کہا کہ اگرچہ ملک کی ۹۵ فیصدی اکثریت دنگے فساد اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کو نہ صرف ناپسند کرتی ہے بلکہ نفرت کرتی ہے مگر وہ ان مٹھی بھر فسادی عناصر کے مقابلہ سے پہلوتہی کرتی رہتی ہے۔ انھوں نے کہا "ظلم و جبر اور قتل و غارت کے مقابلے میں اکثریت کی یہ بے بسی اس کی بے عملی کا نتیجہ ہے۔ مرکزی نائب وزیر نے ادیبوں اور شاعروں

...کیونکہ اگر اس وقت ملک کے حالات کو سنبھالا نہ گیا تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا اور آنے والی نسلیں ہماری آج کی کوتاہی کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ یہ ایک روزہ کنونشن اور مشاعرہ شہر کی تاریخی عمارت قیصر باغ بارہ دری میں ہوا۔ (قومی آواز)

قومی یک جہتی کنونشن سے ہندی ادیبوں کا واک آؤٹ

لکھنؤ، فرقہ واریت کے خلاف اور قومی یک جہتی کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے مرکزی نائب وزیر الحاج محمد یونس سلیم نے شکایت کی کہ ان کو دعوت نامہ جس لیٹر پیڈ پر بھیجا گیا وہ صرف ہندی میں تھا۔ انھوں نے کہا "غالب صد سالہ جشن کمیٹی کے نام پر ہونے والے اس کنونشن میں اردو کو نظر انداز کر دیا بہت افسوسناک ہے" انھوں نے زور دے کر کہا "اس ملک میں اردو بھی چلے گی ہندی بھی چلے گی اور انگریزی بھی چلے گی ورنہ کوئی زبان نہیں چلے گی"۔ مرکزی نائب وزیر یونس سلیم صاحب جس وقت مذکورہ بالا باتیں کر رہے تھے بعض مقامی ہندی ادیبوں میں بے چینی محسوس کی گئی اور ان کی تقریر ختم ہوتے ہی جناب یشپال، جناب بھگوتی چرن ورما، جناب بیدھر لک بنارسی اور جناب ٹھاکر پرشاد جلسہ گاہ سے اٹھ کر چلے گئے۔

(قومی آواز)

کرانتی دل اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے حق میں نہیں ہے

نئی دہلی، بھارتیہ کرانتی دل پارٹی کی سینٹرل اگزیکٹیو نے یہاں اپنے دو روزہ اجلاس میں انتخابی منشور کی منظوری دی۔ منشور میں یوپی کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ کرانتی دل اور اردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بنانا چاہتا کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی تعلیم ہر طالب علم کے لئے لازمی قرار دینا ہوگی لیکن وہ اس زبان کی ہر قسم کی حوصلہ افزائی کی حامی ہے۔ (ریاست)

ریپبلکن پارٹی کے منشور میں اردو شامل نہیں ہے

لکھنؤ۔ ری پبلکن پارٹی نے اپنے پیش کئے ہوئے ۲۲ انتخابی پروگرام کی بنیاد پر ریاستی کانگریس سے انتخابی سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریاستی ریپبلکن پارٹی کے لیڈر بی۔ پی۔ موریہ سے دریافت کیا گیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ ۲۲ نکات میں سے کیوں خارج کر دیا گیا۔ موریہ نے جواب دیا کہ کانگریسی لیڈروں کی تجویز پر ایسا کیا گیا۔ (ریاست)

گورکھپور یونیورسٹی میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی تقریر

گورکھپور۔ شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا خیر مقدم کرنے کے لئے شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمود الٰہی کے زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کے شروع میں ڈاکٹر محمود الٰہی نے پروفیسر انصاری کا تعارف کرایا اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

انصاری صاحب نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں ایک غلط رجحان بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ عام طور پر طلبہ ایک سے زیادہ زبان نہیں پڑھنا چاہتے انھوں نے کہا کہ یہ ایک خطرناک زوال کی علامت ہے۔ انھوں نے اردو والوں پر زور دیا کہ وہ ہندی، فارسی اور ایک یورپی زبان لازمی طور پر پڑھیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنے ادب کو اس وقت تک ترقی نہیں دے سکتے جب تک کہ اس کا دروازہ باہر کے خیالات کے لئے کھلا نہ رکھیں۔ انصاری صاحب نے اپنی تقریر میں اردو نثر کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا اور کہا کہ مولانا حالی نے نثر کو جس منزل پر لا کے چھوڑا تھا، وہ ایک خوش آئند علامت تھی لیکن ان کے بعد کی نسل نے اسے آگے بڑھانے کے بجائے اور پیچھے ڈھکیل دیا۔ انصاری صاحب نے سرشار، کرشن چندر اور ابو الکلام آزاد کی نثر پر سخت تنقید کی اور کہا کہ ان ادیبوں کی نثر کو معیاری نثر کے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ موجودہ اردو نثر رومانیت عدم توضیح اور شوکت الفاظ میں اسیر ہوتی جا رہی ہے۔ انصاری صاحب نے تنقید کی زبان پر بھی اظہار خیال کیا اور کہا کہ یہ صحیح ہے کہ تنقید سائنس نہیں ہے لیکن تنقید کی زبان کو سائنس کی زبان کی طرح واضح اور غیر مبہم ہونا چاہئے۔ آخر میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے شعبۂ اردو کے طلبہ اور اساتذہ کی طرف سے انصاری صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ (منور حسین)

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

مخصوص آئیڈیالوجی سے وابستگی کے بجائے پوری زندگی سے گہری وابستگی پر زور دیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ لوگ جو ادب سے زیادہ سیاسی فارمولوں کو عزیز رکھتے ہیں، اس میلان میں خطرہ محسوس کرتے ہیں حالانکہ اونچ نیچ اور افراط و تفریط کے باوجود مجموعی طور پر یہ میلان قابل قدر ہے اور اس میں زبان اور اظہار کے تجربے اپنے اندر خاصے اہم امکانات رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر نیا میلان اور ہر ہیئتی تجربہ سراہا نہیں جا سکتا، مگر جو لوگ تجربے سے مخالف ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح کے (VESTED INTEREST) کی نمائندگی ضرور کرتے ہیں۔

"آج کل" کا اردو نمبر اگر آزادی کے بعد اردو زبان کا جائزہ علیحدہ لیتا اور آزادی کے بعد ادب کا علیحدہ تو بہتر ہوتا پھر بھی موجودہ صورت میں یہ زبان و ادب کے مسائل کے متعلق بہت کچھ دیتا ہے اور اس میں مسرت اور بصیرت اور عبرت تینوں کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ کاش اردو دوست اس سے یہ سبق بھی سیکھیں کہ حالات پر ماتم کرنے اور دوسروں کو الزام دینے سے کچھ نہیں ہوتا عزم کو پکی اور نئے حالات کا عرفان ہو تو ہر پتھر سے جوئے شیر نکالی جا سکتی ہے۔

آل احمد سرور

میرا صفحہ

جو لوگ ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنے "تاثرات اور تجربات کی روشنی میں اپنی رائے دیتے ہیں ظاہر ہے کہ ان "تاثرات اور تجربات کی بھی اہمیت ہے، مگر ضرورت یہ ہے کہ ان کو معروضی حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی جائے۔ جمہوری ہندوستان میں تمام قومی زبانوں کی ترقی لازمی ہے۔ اردو کی ترقی بھی اس رو میں ہوتی، مگر اردو کچھ مخصوص سیاسی حالات کا شکار ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ مگر کوئی یہ کہے کہ اردو ختم ہو رہی ہے یا چند سال کی مہمان ہے تو یہ زیادتی ہوگی۔ اردو دوستوں کا اصل کام یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے طور پر اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے لئے کوشش کریں اور دوسری طرف جمہوری میلانات، سیکولر رجحانات، قومی نظریات کو اپنائیں اور ملک کے دکھ درد میں دل و جان سے شریک ہوں تاکہ اردو کے خلاف چند اجارہ پرست اور تنگ نظر پارٹیوں نے جو محاذ بنا رکھا ہے وہ ٹوٹ سکے اور اردو کی ترقی کو بھی لوگ قومی زبانوں کی ترقی اور اس طرح قومی یک جہتی کا فروغ اور قومیت کا استحکام سمجھ سکیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات جو اردو کی ترقی میں حائل ہے وہ مجموعی طور پر اردو دوستوں کا زبان و ادب کے پرانے خیالات اور نظریات سے چمٹے رہنا ہے۔ زبانیں کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتیں ان میں برابر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اردو کی وہی شکل باقی رہے جو انیسویں صدی میں تھی، وہ چاہے نیک نیت ہوں مگر ان کی مایوسی یقینی ہے۔ بیسویں صدی میں اردو کو ترقی کرنا ہے تو اسے جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنا پڑے گا اور نشر و اشاعت اور درس و تدریس کے نئے طریقوں کو اپنانا پڑے گا۔ ہاں اسے اردو ہی رہنا چاہئے تغیر کی رو میں کچھ اور نہ بن جانا چاہئے۔

"آج کل" دہلی کا اردو نمبر اس سلسلے میں ہمارے لئے مسرت اور عبرت دونوں کا سامان رکھتا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود دشواریوں اور پابندیوں کے آزادی کے بعد اردو زبان کے بولنے والوں کی تعداد بڑھی ہے۔ اردو میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد جو ہونی چاہئے تھی ریاستی حکومتوں کی غفلت کی وجہ سے نہیں ہے، مگر اس میں آسانی سے اضافہ ہو سکتا ہے۔ ثانوی اسکولوں میں ایک مضمون کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے یا تیسری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے اگرچہ اتنے نہیں جتنے ہونے چاہئیں، مگر پہلے سے زیادہ ہیں اور یونیورسٹیوں میں تو اردو کی تعلیم کی نمایاں ترقی ہوئی ہے اور آج چالیس یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ اس طرح اردو کے اخبارات و رسائل کی تعداد میں بھی آزادی کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ اردو کی کتابوں کی صحیح تعداد معلوم ہونا مشکل ہے، مگر آج کل کے ادارے کے اندازے کے مطابق دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ بہر حال تمام اردو دوستوں کو آج کل کے اردو نمبر کے وہ مضامین غور سے پڑھنا چاہئیں جن میں اردو زبان آزادی کے بعد، اردو بیرونی ممالک میں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کی رفتار، اردو صحافت آزادی کے بعد، ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کاروبار آزادی کے بعد، اور اردو کی ترقی کے لئے حکومت ہند کے اقدامات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں خاص طور پر ایڈیٹر کا مضمون ہندوستان میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کاروبار آزادی کے بعد، غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے اشاعت اور کاروبار کے مخصوص مسائل کا علم ہوگا جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں نہیں ہوتے اور جن کی طرف توجہ سے یقیناً ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ اعداد و شمار مہیا کرنے کی جو کوشش اس نمبر میں کی گئی ہے وہ باوجود بعض کوتاہیوں کے قابل قدر ہے اور اس سلسلے میں مزید اور مکمل اعداد و شمار مہیا کرنے کی شدید ضرورت کو اور زیادہ واضح کرتی ہے۔

آزادی کے بعد ادب کا جائزہ بھی اس لحاظ سے مفید ہے کہ لکھنے والوں نے تحقیق، تنقید، ناول، افسانہ، طنز و مزاح، ۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم، جدید شاعری کا تنقیدی مطالعہ اور اردو ڈراما اور اسٹیج کے اہم میلانات کا جائزہ لیا ہے۔ اردو تحقیق پر مضمون معلوماتی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے باوجود کوتاہیوں کے تحقیق کا ایک اچھا معیار رفتہ رفتہ سامنے آ رہا ہے۔ اردو تنقید پر مضمون بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہے اور اگرچہ اس میں اشارے زیادہ ہیں اور بہت سی چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل کے پڑھنے والوں کے لئے شاید زیادہ مفید نہیں ہے، مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اردو تنقید اب فارمولوں اور نسخوں کے چکر سے نکل رہی ہے اور کچھ ادبی شعبدہ بازوں یا چھلاوں کے باوجود، اپنے منصب کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ ناول پر مضمون میں اردو میں اچھے ناولوں کی کمی کی طرف بجا اشارہ کیا گیا ہے اور شاید اسی کی وجہ سے ناول کے فن کے ساتھ انصاف کرنے کا جذبہ ابھر سکے۔ طنز و مزاح پر مضمون نسبتاً سطحی ہے کیونکہ طنز کی تلخی اور مزاح کی کمی کے سماجی اسباب پر نظر نہیں ڈالی گئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم اور جدید شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دونوں مضمون بہر حال یہ واضح کر دیتے ہیں کہ اب شاعری وقتی سیاست کی غلام نہیں رہی۔ شاعر کی انفرادی بصیرت اور ذاتی احساس کی ترجمانی کی کوشش کر رہا ہے در اصل یہ کسی

باقی صفحہ ۱۱

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید ضیاء علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا